معرفتِ ذات اور آج کا مسلم نوجوان

ایشو بریف

یہ تحریر انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز میں ۱۹ جون ۲۰۲۳ء کو ہونے والے مذاکرے بعنوان "Muslim Youth Today: The Question of Identity" میں ہونے والی گفتگو سے ماخوذ ہے۔ مذاکرے کے شرکاء میں پروفیسر سامی العریان، ڈائریکٹر سیگا استنبول، پروفیسر جنید ایس احمد، کالج آف ولیم اینڈ میری، امریکہ، پروفیسر محی الدین ہاشمی، ڈین شعبہ فکرِ اسلامی علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، ڈاکٹر وقاص خان، ہیڈ، شعبہ علومِ اسلامیہ، رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی، ڈاکٹر غلام حسین، اسسٹنٹ پروفیسر، بحریہ یونیورسٹی، عمار محبوب، کیریکٹر ایجوکیشن فاؤنڈیشن، ڈاکٹر محمد ریاض، اسسٹنٹ پروفیسر، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، ڈاکٹر افشاں ہما، اسسٹنٹ پروفیسر، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، ڈاکٹر حافظ طاہر اسلام عسکری، اسسٹنٹ پروفیسر، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، ایڈووکیٹ امینہ سہیل، ابو سعد، یوتھ کلب، ڈاکٹر فخر الاسلام، ڈائریکٹر ریسرچ اینڈ اکیڈمک آؤٹ ریچ، آئی پی ایس، اور خالد رحمٰن، چیئرمین آئی پی ایس شامل تھے۔

آج کے مسلمان کو درپیش مسائل میں سے ایک مسئلہ اپنی شناخت کا ہے۔ ایک سوال جس سے ہر انسان کو پالا پڑتا ہے، وہ یہ ہے کہ "میں کون ہوں؟" (Who am I?)۔ ہر فرد اس سوال کا جواب اپنے انداز میں دیتا ہے۔ بیشتر افراد اس اہم سوال پر زیادہ سوچتے تو نہیں لیکن سماجی دھارے میں بہتے ہوئے اپنا ایک مقام اور کردار متعین ضرور کر لیتے ہیں۔ جو لوگ اس سوال کو سوچتے ہیں، ان میں سے بھی ہر ایک کا انداز، نقطۂ نظر اور سوچ کی گہرائی مختلف ہوتی ہے۔ مسلمانوں اور بالخصوص مسلم نوجوانوں کے لیے یہ سوال اس لیے زیادہ اہم ہے کہ حالات اور واقعات نے انہیں اس سوال پر غور کرنے پر یوں مجبور کر دیا ہے کہ ان کے سامنے اب کوئی ایک نمایاں جواب نہیں ہے۔ بیشتر کا حال یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک کے گھرانے، خاندان اور روایت نے جس چیز کو اس کی شناخت قرار دیا ہوتا ہے، معاشرہ اس کی نفی کرتا ہے۔ وہ اگر اپنے گھر سے مسلمان بن کر نکلتا ہے تو اس کی تعلیم گاہ، ریاست، عدالت، معاشرت اور بازار میں اصرار اس بات پر کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی اس شناخت کو بالائے طاق رکھ دے۔ وہ اگر خود کو ایک امت کا حصہ سمجھنا چاہے تو قومی ریاستوں کی سرحدیں اس کی راہ روکتی ہیں۔ یہاں تک کہ کبھی اپنی شناخت کو بچانے اور کبھی انسانوں کے سمندر میں اپنی اہمیت جتانے کے لیے وہ نسل، نسب، رنگ اور زبان کو فخر اور امتیاز کی بنیاد سمجھنے لگتا ہے۔

ایک الجھن یہ ہے کہ عموماً شناخت، شخصیت اور کردار میں فرق ملحوظ نہیں رکھا جاتا۔ **شناخت** درحقیقت مذکورہ بالا بنیادی سوال "میں کون ہوں؟" کے جواب کا نام ہے۔ اس کا تعلق جن امور سے ہے ان میں ہم کون ہیں، کس لیے ہیں، کس عقیدے پر یقین اور کن اقدار سے نسبت رکھتے ہیں، شامل ہیں۔ دوسری جانب انسان کی **شخصیت** اس کی روزمرہ خصوصیات سے مربوط ہے مثلاً وہ تنہائی پسند ہے یا میل جول کا شیدائی؟ اسی طرح انسان کا مزاج بھی اس کی شخصیت کا ہی عکاس ہوتا ہے۔ یعنی یہ کہنا بجا ہوگا کہ انسان کا رویہ اس کی شخصیت کی عکاسی کرتا ہے۔ **کردار** بھی کسی نہ کسی حد تک شخصیت ہی کا نام ہے تاہم اس سے مختلف قسم کے حالات میں انسان کے فیصلہ کرنے کی صلاحیت ظاہر ہوتی ہے۔ کردار کو اس بات کا جائزہ کہنا بجا ہوگا کہ ہر قسم کے حالات، دباؤ اور تناؤ کے ماحول میں انسان اپنی بنیادی اقدار کو ملحوظ رکھتا ہے یا پسِ پشت ڈال دیتا ہے۔

شناخت کی اقسام و درجات

بعض افراد پختہ اور بعض متردّد شناخت (Fluid Identity) کے حامل ہوتے ہیں۔ پختہ شناخت کا حامل اپنی شناخت کے بارے میں پُر یقین ہوتا ہے جبکہ متردد شناخت رکھنے والا شخص مسلسل اس شک و شبہ میں مبتلا رہتا ہے کہ وہ کون ہے اور آخر اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے۔ اسی طرح ایک انسان کی شناخت کے کئی درجات ہوتے ہیں جنہیں بنیادی، ثانوی اور ثالثی درجات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ یوں تو ہر فرد اپنی شناخت کا تعین خود اپنی تعریف اور پہچان کے ذریعے کرتا ہے لیکن اس کا خاندان، اس کی قوم، قبیلہ، سیاسی وابستگی، سماجی حیثیت، تعلیم، اور ذہنی و جسمانی قابلیت اس کی شناخت کے مختلف ذرائع ہیں۔ عموماً ایک فرد اپنی بنیادی شناخت خود متعین کرتا ہے اور پھر اسی بنیادی شناخت کی بنا پر اس کا رویہ تشکیل پاتا ہے۔ اسی تناظر میں دیکھا جائے تو انسان کی بیک وقت کئی شناختیں ہو سکتی ہیں لیکن جب وہ کسی ایک بنیادی شناخت کا تعین کر لے تو دیگر تمام شناختیں اس ایک متعین شناخت کے تحت آجاتی ہیں۔ بنیادی شناخت کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ انسان کی اپنی منتخب کردہ ہو اور اس انتخاب میں کسی دوسرے کا عمل دخل نہ ہو۔

اس دنیا کو دیکھنے کے بعد ایک انسان کے ذہن میں دو طرح کے تصورات آتے ہیں۔ ایک تو یہ تصور کہ یہ دنیا باقاعدہ کسی منصوبے کے تحت مرتب کی گئی ہے اور دوسرا اس کے برعکس یہ خیال کہ یہ حادثاتی طور پر از خود وجود میں آگئی ہے۔ اگر غور کرنے پر اسے محسوس ہو کہ یہ نظام باقاعدہ کسی حکمتِ عملی کے تحت وجود میں آیا ہے تو اس کے فوراً بعد اسے یہ خیال آتا ہے کہ اس دنیا کو بنانے والا یقیناً غیر معمولی صفات کا حامل ہو گا کیونکہ یہ کسی عام ہستی کے بس کا کام تو نہیں لگتا۔ اگلے مرحلے پر یہ سوال انسان کے ذہن میں آتا ہے کہ اگر اس دنیا کو باقاعدہ کسی منصوبے کے تحت تخلیق کیا گیا ہے تو یقیناً یہاں رہنے کے لیے کوئی راہنمائی بھی مہیا کی گئی ہو گی۔ یہی فکر دینِ حنیف کی جانب پہلا قدم ہے۔

توحیدی اور سیکولر نظریے میں بنیادی فرق

سیکولر اور توحیدی نظریے کو ایک مثال کے ذریعے سمجھا جا سکتا ہے۔ سیکولر نظریے کی مثال ایک سیدھی لکیر کھینچ کر دی جا سکتی ہے جس کی ایک جانب انسان اور دوسری جانب دنیا ہے۔ انسان تنہا اس دنیا کو مسخر کرنے کی جدوجہد میں مصروفِ عمل رہتا ہے۔ اس کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنے علم کی بنیاد پر دنیا اور اس میں موجود ہر شے کا احاطہ کر لے۔ جبکہ دنیا دراصل خدا کے زیرِ اختیار اور اسی کے تابع ہوتی ہے۔ انسان اس وقت تک کسی نہ کسی حد تک بے بس اور مایوس رہتا ہے جب تک خدا کے عطا کردہ علم کی بنیاد پر اس دنیا کی مختلف اشیاء اور اپنے خیالات کو سمجھ نہ لے۔ اس کے برعکس توحیدی نظریہ ایک مثلث کی مانند ہے جس کی ایک جانب خدا، دوسری سمت انسان اور تیسری طرف دنیا ہے۔ خدا اس مثلث میں مرکز کی حیثیت رکھتا ہے اور دنیا کی حیثیت ایک ایسی شے کی سی ہے جسے انسان خدا کے دیئے گئے علم کی بنیاد پر سَر کر سکتا ہے۔ نیز اس کی دی گئی وحی کے سہارے دنیا کی زندگی کا بہتر استعمال کر سکتا ہے۔

توحیدی نظریۂ شناخت اور اس کا دائرہ کار

ماہرینِ علوم الٰہیات کے مطابق توحید اسلام کا ایک بنیادی رکن ہے۔ اسلام اللہ تعالیٰ کے لیے مکمل اطاعت اور سپردگی کا نام ہے اور اللہ کی بیان کردہ، اعلان کردہ اور تقسیم کردہ رضا پر راضی رہنے کا نام توحید ہے۔ ان کے خیال میں توحید خدا کی ان صفات و خصوصیات کا اقرار ہے جو صرف اس کے لیے خاص ہیں، جن میں اس کا کوئی ہمسر نہیں۔ وہ توحید سے اس کی عبادات، خصوصیات اور اطاعات میں یکتائی مراد لیتے ہیں اور اسی کے مطابق مسلمانوں کے مختلف درجات متعین کرتے ہیں۔ جبکہ حق تو یہ ہے کہ توحید کے ضمن میں ان تمام عقائد کے ساتھ ساتھ خدا اور اس کی مخلوق کے باہمی تعلق کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

توحیدی نظریہ کے دو دائرہ کار ہیں۔ اوّل تو یہ کہ خدا ہی وہ واحد ہستی ہے جس کے پاس علم، قابلیت، طاقت، اختیار، رحم، سخاوت، عدل اور دیگر ایسی صفات ہیں جن کا احاطہ کوئی نہیں کر سکتا۔ دوم یہ کہ خدا کے علاوہ ہر چیز ایک ماورائی تخلیق ہے۔ نیز محدود ہے اور اس میں کہیں نہ کہیں نقص پایا جاتا ہے۔ مختصراً، خدا کی ذات لامحدود و لازوال ہے اور وہ اپنی صفات میں یکتا اور بے نیاز ہے جبکہ انسان کی ذات محدود ہے، اسے زوال ہے اور وہ اپنے ہر کام میں اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کا محتاج ہے۔

معرفتِ ذات اور وحیِ الٰہی

انسان خود کو درپیش مختلف پیچیدہ سوالات کا جواب اپنی محدود عقل کی بنیاد پر نہیں دے سکتا۔ خدا، اس کی ذات اور صفات سے متعلق سوالات کا جواب محض انسان کے حواسِ خمسہ سے ممکن نہیں ہے۔ حواسِ خمسہ ان چیزوں کو محسوس کرتے ہیں جو ظاہری طور پر موجود ہوں۔ جہاں حواسِ خمسہ کے استعمال کی انتہا ہوتی ہے وہیں سے عقل کے استعمال کا آغاز ہوتا ہے۔ انسان ہمیشہ اس زعم میں مبتلا رہتا

ہے کہ وہ اپنی عقل کے ذریعے پورے عالم کو مسخر کر سکتا ہے۔اس میں شک نہیں کہ حقائق کی تلاش اور الجھنوں کو دور کرنا عقل ہی کے ذریعے ممکن ہے۔ لیکن انسان کی زندگی میں ایک مرحلہ ایسا آتا ہے جہاں انسانی عقل بھی جواب دے جاتی ہے۔یہی وہ موقع ہوتا ہے جہاں اسے وحی کا سہارا درکار ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ علم الشھود کا ادراک تو حواسِ خمسہ کے ذریعے ممکن ہے مگر ماوراء القیاس اشیاء سے آگاہی کے لیے وحی ایک اہم ذریعہ ہے۔

انسان کی معلوم تاریخ پر نگاہ دوڑائی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ انسان کی لکھی گئی تاریخ میں ہمہ وقت شبہ کا احتمال رہتا ہے۔اور اگر اس میں شبہ نہ بھی ہو تو انسان کو اپنی لکھی گئی ہر بات کی درستگی کا ثبوت مہیا کرنا پڑتا ہے۔اب یہی حال دیگر الہامی کتب کا ہے جن کے الفاظ تک میں رد و بدل کر دیا گیا ہے۔ چونکہ اب وہ خدائے بزرگ و برتر کا کلام نہیں رہا اس لیے اس میں شک و شبہ موجود ہے۔ اس کے برعکس قرآن مجید کا معاملہ یکسر مختلف ہے۔ یہ اللہ تعالی کی نازل کردہ ایک ایسی کتاب ہے جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں، نہ ہی اس میں انسانی الفاظ شامل کیے گئے ہیں۔اس میں رد و بدل کی کوششیں کبھی کامیاب نہ ہو سکیں جس کی اہم ترین وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالی نے اس کی حفاظت کا ذمہ خود لیا ہے۔ یہی اعتماد ایک مسلمان کا اپنے دین پر ایقان مزید بڑھاتا ہے۔

ایک مسلمان توحید کے ساتھ خدا کی بھیجی گئی کتب پر بھی یقین رکھتا اور ان سے راہنمائی حاصل کرتا ہے۔ یہ کتب اس کے حیات، مقصدِ حیات اور بظاہر معدوم اشیاء سے متعلق جنم لینے والے سوالات کے جواب مہیا کرتی ہیں۔ قرآن کی پہلی آیت اقرا باسم ربك الذی خلق[1] میں واضح طور پر علم حاصل کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ اس علم ہی کے ذریعے معرفتِ ذات ممکن ہے۔ اس علم کو استعمال کرتے ہوئے انسان اگر درست سمت چلے تو وہ ایک ہی راستے کا راہی ہوتا ہے۔ بصورت دیگر وہ بیک وقت کئی راہوں پر چل نکلتا ہے۔ بالعموم یہی نامعلوم راہیں اسے سیکولر نظریہ حیات کی جانب لے جاتی ہیں۔

چند بنیادی سوالات اللہ تعالی کی جانب سے فطری طور پر بنی نوع انسان میں ودعیت کر دیئے گئے ہیں جن میں، میں کون ہوں؟ کیا میرا کوئی خالق بھی ہے؟ کیا اس کائنات کا کوئی خالق ہے یا یہ از خود حادثاتی طور پر وجود میں آگئی ہے؟ اگر کوئی خالق ہے تو کیا اس کی اس تخلیق کا کوئی مقصد بھی ہے؟ اور اگر مقصد ہے تو وہ کیا ہے؟ شامل ہیں۔ان سوالات کے جوابات ربِ تعالی نے بذریعہ وحی خود بیان کر دیئے ہیں۔ وحی کی بنیادی طور پر دو صورتیں ہیں۔ایک صورت تو بالواسطہ ہے یعنی انبیاء کے ذریعے، اور دوسری صورت میں کچھ رہنمائی بلاواسطہ ہر انسان کو دے دی گئی ہے جن کے ذریعے وہ بعض اشیاء کو خود سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ میں کون ہوں اور میری شناخت کیا ہے؟ [Who am I and what identifies me?] کے حوالے سے بالواسطہ وحی یعنی قرآن و سنت کی کئی نصوص راہنمائی فراہم کرتی ہیں۔ارشادِ باری تعالی ہے: هو سمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ[2] [اللہ تبارک و تعالی نے تمھارا نام/شناخت مسلمان رکھی ہے]۔اسلام کی تعریف "submission to the ultimate truth" ہی ایک مسلمان کی اصل شناخت ہے۔اس تعریف میں ultimate truth سے مراد اللہ تعالی کی ذات اور اس کی وحدانیت ہے۔ اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار بغاوت ہے۔اس میں شک نہیں کہ حقیقتِ اعلی کو قبول کرنے سے انسان فطرت سے منسلک ہو جاتا ہے اور اس کے داخلی خدشات بھی دور ہو جاتے ہیں۔یوں وہ داخلی و خارجی دونوں طرح سے سلامتی میں آجاتا ہے۔

شناخت کے حوالے سے قرآن کریم کی مختلف نصوص میں راہنمائی فراہم کی گئی ہے۔هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا۔ اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا[3] یعنی انسان کی اصل اور بنیادی حیثیت یہ ہے کہ وہ کچھ نہ تھا، اللہ نے اسے ایک بہت بڑا رتبہ دیا اور پھر سمیع اور بصیر بنایا۔اسی طرح اللہ تعالی فرماتے ہیں اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً[4] یعنی میں اس دنیا میں انسان کو اپنا نائب بنا رہا ہوں۔ نیابتِ خالق قرآن و سنت کی عطا کردہ ایک بہت بڑی ذمہ داری اور امانت ہے جو انسان کے سپرد کی گئی ہے۔اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ الْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَ اَشْفَقْنَ مِنْهَا وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ[5] سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صلاحیت اللہ نے صرف انسان کو عطا کی ہے

---

[1] العلق:۱

[2] الحج:۷۸

[3] الدھر:۲،۱

[4] البقرۃ:۳۰

[5] الاحزاب:۷۲

کہ وہ اللہ کی خلافت کی ذمہ داری اٹھا سکے۔ اسی طرح قرآن مجید ہمیں یہ بھی تعلیم دیتا ہے کہ لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ[6] یعنی انسان کی شناخت یہ ہے کہ اس کو تمام مخلوقات میں افضل ترین بنایا گیا ہے۔ اسی طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے کہ مَا مِنۡ مَّوۡلُوۡدٍ اِلَّا یولد عَلَی الۡفِطۡرَۃِ[7] یعنی بوقتِ پیدائش فطرت سے مربوط ہونا بھی انسان کی پہچان ہے۔

شناخت کے حوالے سے اسلام اور دیگر مذاہب کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ **پیدائشی مثبت شناخت** ایک ایسا نظریہ ہے جو محض اسلام کا عطا کردہ ہے۔ دیگر مذاہب میں یہ معاملہ قدرے مختلف ہے۔ عیسائیت میں انسان کی پیدائشی شناخت پیدائشی گنہگار کی ہے یعنی یہ اس کی شناخت کے ساتھ منسلک ہے کہ کسی جرم کا ارتکاب کیے بغیر بھی وہ گنہگار ہے۔ اس کی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ اسے اپنے جدّ حضرت آدم سے سرزد خطا وراثت میں ملی ہے۔ شناخت کا یہی تصور اسلام کو دیگر مذاہب سے ممتاز کرتا ہے۔

شناختی بحران اور مسلم شناخت کے اہم عوامل

انسانی شناخت کے کئی اہم عوامل ہیں۔ بالخصوص جب ایک مسلمان کے حوالے سے بات کی جائے تو ایک رائے یہ ہوتی ہے کہ صرف اسلامی نام رکھنا ہی اسلامی شناخت کے لیے کافی ہے۔ کئی معاشروں میں اس سے بڑھ کر کوئی مسلم شناخت نہیں ہوتی۔ اسی طرح بعض معاشروں میں ظاہری رسوم [Islamic rituals] پر عمل پیرا ہونا اسلامی شناخت کہلاتا ہے۔ بعض جگہوں پر حلیے کو بہت اہمیت دی جاتی ہے اور انسان کا ظاہری حلیہ، اوڑھنا بچھونا اور اٹھنا بیٹھنا اس کی شناخت بن جاتا ہے۔ شناخت کے ان عوامل کو مختلف معاشروں میں مختلف اعتبار سے ترجیح حاصل ہے۔

نوجوان جب بلوغت کے مراحل میں قدم رکھتا ہے تو رونما ہونے والی مختلف النوع جسمانی، ذہنی، فکری اور جذباتی تبدیلیاں اس کے تشخص کے تشکیل میں نمایاں کردار ادا کرتی ہیں۔ بالعموم انسان اور بالخصوص نوجوان کو درپیش ایک بڑا مرحلہ خود شناسی یعنی معرفتِ ذات کا مرحلہ ہوتا ہے۔ اسے کائنات شناسی [worldview] بھی کہا جا سکتا ہے۔ یہ کائنات شناسی دراصل انہی سوالات پر مبنی ہے جن کا ذکر گزرا کہ جب انسان آنکھ کھولتا ہے تو دیکھتا ہے کہ اس عالم ہست و بود کا کوئی خالق ہے بھی یا نہیں؟ اگر ہے تو ان تخلیقات کا مقصد کیا ہے؟ کیا صرف اپنی صفتِ خلاقیت کا اظہار مقصود تھا اور اسی غرض سے ساری کائنات کو بچھا دیا گیا ہے؟ یا اس کے پیچھے کوئی اور اہم مقصد بھی ہے؟ ان سوالات کا جواب کائنات شناسی میں معاون ہوتا ہے۔ چونکہ خود انسان بھی اسی کائنات کا حصہ ہے تو اس کے بنیادی سوالات میں اپنی ذات سے متعلق سوالات بھی شامل ہیں کہ میں کون ہوں؟ میرا خالق کون ہے؟ مجھے کس مقصد کے لیے پیدا کیا گیا ہے؟ اور اس کائنات کے ساتھ میرا رشتہ اور تعلق کیا ہے؟

درج بالا تمام سوالات خود شناسی کا پہلا زینہ ہیں۔ نوجوان ان بنیادی سولات پر غور کرنے سے مختلف شناختوں کے تصادم کے مرحلے سے گزرتا ہے۔ بعض اوقات اس کی مذہبی شناخت، قومی شناخت اور عالمی شناخت میں باہم فرق ہوتا ہے۔ ان تمام شناختوں میں توازن قائم کرنا اور اختلاف کی صورت میں تطبیق و ترجیح دینا ایک بڑا مسئلہ ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ کن اصول وضوابط کے تحت مجھے اس بات کا ادراک ہو سکے گا کہ کن اشیاء کو اپنایا جائے اور کن کو ترک کرنا چاہیے۔ شناخت کے ضمن میں ایک بہت بڑا سوال یہ ہے کہ کون سی چیزیں ایسی ہیں جو شناخت کا تعین کرتی ہیں اور کن چیزوں کا میری شناخت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ آج کے نوجوان نے یہ جو بیک وقت کئی شناختیں تصور کر لی ہیں ان میں سے اکثر تو بنیادی شناخت کے لازمی حصے کے طور پر دیکھی جاتی ہیں لیکن بعض شناختیں ایسی ہیں جن کا اس کی اصل شناخت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

نوجوان جس وقت مختلف شناختوں کے تصادم کے اس مرحلے سے گزرتا ہے تو اس دوران اسے درپیش ایک بہت بڑا چیلنج ان شناختوں میں باہم توازن و موافقت پیدا کرنا ہوتا ہے۔ موافقت کے اس عمل میں ناکامی کی صورت میں سنگین نتائج کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایک فکری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ نوجوان الجھاؤ کا شکار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اپنی میراث سے بددل ہونا، احساسِ کمتری میں مبتلا ہونا اور داخلی تضاد کا شکار ہونا بھی اس کے اہم نتائج ہیں۔ اسی کشمکش میں بسا اوقات وہ دوہری شناخت یا میڈیا جنریٹڈ سٹینڈرڈز اختیار کر لیتا ہے اور وہی اس کی شناخت بن جاتے ہیں۔ اگر اسے درپیش تحدیات کا مناسب اور بروقت جواب نہ ملے تو اسے مذکورہ بالا تمام مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ ایک ایسی مشکل اور ایسا نقصان ہے جسے

---

[6] التین: ۴

[7] صحیح مسلم، کتاب القدر، حدیث نمبر ۲۶۵۸

حل کرنا اور جس کی تلافی کرنا اہلِ علم، اہل تحقیق اور اہل اجتہاد کی سب سے بڑی ذمہ داری ہے۔

مسلم شناخت کی وضاحت کرنے میں حدیثِ جبرائیل کا کردار بہت اہم ہے۔ حدیث میں جبرائیل علیہ السلام کے ذریعے امت کو تین چیزوں کی تعلیم دی گئی ہے۔ یہ وہ تین سوالات ہیں جو کسی بھی نظامِ فکر و عمل سے وابستہ افراد اپنی شناخت تشکیل دیتے ہوئے مدِ نظر رکھتے ہیں۔

اوّل، ماالایمان؟ یعنی انسان کے بنیادی فکری اعتقادات کیا ہیں؟ اس کا نظامِ فکر و عمل کیا ہے؟ ایمانیات کیا ہیں؟ اور ورلڈ ویو کیا ہے؟ دوم، ماالاحسان؟ یعنی اس کے اختیار کردہ اس نظامِ فکر و عمل اور ان اعتقادات کا بنیادی مقصد کیا ہے؟ اور سوم، ماالاسلام؟ یعنی اس کے ان بنیادی اعتقادات کے تحت متعین کردہ مقاصد کے حصول کے لیے لائحہ عمل کیا ہے؟ اور پھر اس لائحہ عمل کی وضاحت ارکانِ اسلام کے ذریعے کی گئی ہے۔ حدیثِ مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی شناخت کے حوالے سے دو چیزوں کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ قطعیات (ثوابت)، اور ظنیات (متغیرات)۔ انسان کی شناخت کا تعین ثوابت سے ہوتا ہے اور ظنیات کا اس کی شناخت کی تشکیل میں کوئی کردار نہیں ہوتا۔ مثلاً ماالایمان، ماالاسلام اور اعلیٰ اخلاقی اقدار قطعی اور متعین ہیں لیکن جن چیزوں کا تعلق ظنیات یا اجتہاد سے ہے ان میں وقت و حالات کی مناسبت سے تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں۔ وقتاً فوقتاً رونما ہونے والی ان تبدیلیوں ہی کی وجہ سے وہ انسان کی شناخت کو متعین نہیں کر سکتیں۔ اول تو مسلم نوجوان کو یہ باور کروانے کی ضرورت ہے کہ کئی اشیاء جنہیں اس نے اپنی شناخت سمجھ لیا ہے، درحقیقت ان کا اس کی اصل شناخت سے دور دور تک کوئی واسطہ نہیں ہے۔ وہ ایسی چیزیں ہیں جن کا تعلق ظنیات یا اجتہاد سے ہے اور اسی بنا پر ان میں ردوبدل کی گنجائش اور لچک پائی جاتی ہے۔ اگرچہ دینِ اسلام لازوال اور سدا بہار ہے اور اس سے مکمل استفادہ کرنے میں فائدہ ہی فائدہ ہے، تاہم جب معاملہ شناخت کا آجائے تو اس کا تعین قطعیات ہی کے ذریعے ہوتا ہے اور اس میں ظنیات کا عمل دخل نہیں ہوتا۔

اس شناختی بحران کی ایک اہم وجہ گلوبلائزیشن بھی ہے۔ اس کا خاتمہ تو ممکن نہیں البتہ اس کے اچھے اور برے اثرات پر غور ضرور کیا جا سکتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ اسلام کے علاوہ دیگر تہذیبوں کو بھی نگلتی جا رہی ہے۔ یوں ان تہذیبوں میں موجود شناخت مدہم پڑتی جا رہی ہے۔

اسلاموفوبیا کے نتیجے میں مسلمانوں کی ایک غلط شناخت متعارف کروائی گئی ہے جو مسلم نوجوان کے لیے کسی چیلنج سے کم نہیں ہے۔ مسلم شناخت کے حوالے سے میڈیا اور عالمی سطح پر ایک سٹیریوٹائپ بن چکا ہے۔ یہ ایک ایسا چیلنج ہے جس سے نبرد آزما ہونے کے لیے لائحہ عمل مرتب کرنا اسلامی اجتہادی اداروں اور محققین کی ذمہ داری ہے۔ یہ سمجھنا ضروری ہے کہ اسلاموفوبیا آج کا نہیں، بلکہ ایک تاریخی مسئلہ ہے جو ہر دور میں رہا ہے۔ اس کی کئی مثالیں ہمیں نبی مکرم ﷺ کے دور سے ملتی ہیں مثلاً قرآن کے الفاظ کو تب بھی اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ[8] کہہ دیا جاتا تھا۔ اسی طرح حضور ﷺ کو سَاحِرٌ مُّبِيْنٌ[9] اور دیگر الزامات کا بھی سامنا رہا۔ یقیناً یہ اسلام کی طاقت کا خوف تھا اور اس سے بددل کرنے کے لیے ہی اسلاموفوبیا کو ہر دور میں پروان چڑھایا گیا ہے۔

آج کل ایک بڑا مسئلہ جنسی شناخت کے حوالے سے بھی درپیش ہے کہ کیا جنس کا تعین ایک فرد خود اپنے لیے کرے گا یا یہ فطرت کی طے کردہ ہے؟ قرآن مجید اس جانب بھی رہنمائی فراہم کرتا ہے کہ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ[10]۔ اور فطرت کے اس توازن کو نہ سمجھنے کے نتیجے میں جو فساد برپا ہوتا ہے اسے قرآن حکیم نے ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ[11] کا نام دیا ہے۔ یعنی اس معاملے کو بھی فطرت کے ساتھ متوازی کر کے ہی حل کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر کئی ایسی وجوہات ہیں جن پر غور نہیں کیا جا رہا۔ ایک نقصان دہ رویہ یہ ہے کہ بعض اوقات بہت سی چیزوں کو ضرورت سے زیادہ سہل سمجھ کر اس میں موجود مسائل کا رد کر دیا جاتا ہے۔ اس سے اجتناب لازمی ہے۔

قرآن حکیم ہمیں واضح طور پر یہ بتاتا ہے کہ وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا[12] یعنی امتِ محمدیہ کو اللہ تعالیٰ نے امتِ وسط بنایا ہے۔ یہ بھی اسلام ہی کی عطا کردہ

---

[8] الانفال: ۳۱

[9] یونس: ۲

[10] الروم: ۳۰

[11] الروم: ۴۱

[12] البقرۃ: ۱۴۳

ایک شناخت ہے۔ ایک شناخت تو یہ ہے کہ انسان خلیفہ اور نائب ہے، اس ذمہ داری کے ساتھ اسے امتِ وسط یعنی متوازن اور فکری اعتبار سے ایک معتدل امت بھی بنایا گیا ہے۔ اسی آیت کے اگلے حصے لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ سے یہ وضاحت بھی کر دی گئی ہے کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ آپ باقی انسانیت کے لیے ایک نمونہ بن جائیں یعنی ایک مسلمان کا معتدل اور امتِ وسط ہونا ایک ایسی شناخت ہے جسے اختیار کر کے دیگر امتوں کے لیے عملی نمونہ بنا جاسکتا ہے۔

سفارشات

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اسلام ہر پہلو سے رہنمائی فراہم کرتا ہے تو پھر آخر اس شناختی بحران کی وجہ کیا ہے؟ سچ تو یہ ہے کہ آج کی دنیا میں ہر صبح ایک نئے ''اِزم'' کے ساتھ طلوع ہو رہی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ جس رفتار کے ساتھ آج ہمارے مسائل اور چیلنجز میں اضافہ ہو رہا ہے، ہمارے اجتہادی ادارے بھی اسی رفتار سے آگے بڑھیں۔ مسلم نوجوان ان مسائل کا ہر روز سامنا کرتا ہے، پھر شب و روز مجتہدین، محققین اور اہل علم کی جانب سے ان کے حل کے انتظار میں رہتا ہے۔ ان کی جانب سے دیا گیا ایک معقول جواب اس کی شناخت کو مزید تقویت بخش سکتا ہے۔ یہ اجتہاد اُس مسئلے کو واضح کرنے کے ساتھ اس میں موجود خامیوں کو دور کرنے کی اہلیت رکھتا ہے، نیز انسان کو خدا کے قریب لاتا اور الحاد سے دور کرتا ہے۔ الحاد یقیناً اپنی شناخت سے دوری ہی کا نام ہے۔ یعنی ان تمام مسائل کا واحد حل یہ ہے کہ ہم اپنی اس روایت کا احیاء کریں جس سے ایک اعلیٰ درجے کی تحقیق اور بروقت اجتہاد ممکن ہو سکے۔ اس میں کوئی اشکال نہیں ہے کہ اجتہاد کا حکم اسلامی تاریخ کے ہر دور میں رہا ہے اور یہ سلسلہ کبھی رکا نہیں۔ صورتِ مسئلہ یہ ہے کہ اجتہاد کا عمل موجود تو ہے مگر سست رو ہے۔ مسلمانوں کے مسائل کے انبار لگ چکے ہیں جن کا حل تبھی ہو گا جب اجتہاد کے عمل کو درست وقت میں درست رفتار کے ساتھ موثر بنایا جائے گا۔ اسی صورت میں نوجوان نسل کو درپیش مسائل بالخصوص شناخت کا مسئلہ حل ہو پائے گا۔ یہ ان اجتہادی اداروں کے احیاء کی روایت کو بحال کر کے ہی ممکن ہے۔

بہر حال اس بات کا جائزہ لینا محققین اور مجتہدین کا کام ہے کہ کون سے ایسے پہلو ہیں جو بالکل واضح ہیں اور کن پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اس تحقیق میں غیر مسلم معاشروں میں مقیم مسلمانوں کو درپیش مسائل بالخصوص شناخت کے مسئلے کو اولین ترجیح حاصل ہونی چاہیے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس بات پر واضح تحقیق ضروری ہے کہ شناخت سے متعلق مسائل مسلم نوجوان کو حقیقتاً کس حد تک درپیش ہیں تاکہ بحث محض قیاس پر مبنی نہ ہو۔ غور طلب بات یہ ہے کہ ہر سال اتنی بڑی تعداد میں ہونے والی تحقیق کیا امت کو درپیش اصل مسائل کو دیکھ رہی ہے؟ اگر دیکھ رہی ہے تو کیا ان مسائل کے جوابات بھی فراہم کر پا رہی ہے؟ اور اگر جواب دے رہی ہے تو کیا آج کا مسلم نوجوان اس جواب سے مطمئن بھی ہے؟ یہ اہم ہے کہ ہمارے محققین اور علماء ان سوالات کا ترجیحی طور پر جائزہ لیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ایسی تحقیق کو فروغ دیا جائے جس سے عصرِ حاضر میں درپیش مسائل کا حل ہو سکے۔

****

تیار کردہ:

منیبہ راسخ

جونیئر ریسرچ آفیسر، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز

برائے معلومات:

سید ندیم فرحت

ریسرچ فیلو، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز

nadeem@ips.net.pk